صفتِ رحمت

کا

شانِ امتیاز

الرحمٰن الرحیم کے تفسیری معارف

ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365- ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695

www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

نام کتاب : صفتِ رحمت کا شانِ امتیاز

تصنیف : ڈاکٹر محمد طاہر القادری

پروف ریڈنگ : حافظ محمد فرحان، حافظ عبدالشکور طاہری

کمپوزنگ : بصیر احمد

زیرِ اہتمام : فریدِ ملّت ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ www.MinhajBooks.com

مطبع : منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور

نگرانِ طباعت : شوکت علی قادری

اشاعتِ اوّل تا دوم : جنوری 1986ء تا اگست 1987ء (10,000)

اشاعتِ سوم : مارچ 2003ء (1,100)

قیمت : -/35 روپے

❀❀❀

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / وڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے **تحریکِ منہاج القرآن** کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاج القرآن پبلیکیشنز)

publications@minhaj.biz

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَوْلَایَ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَ الثَّقَلَیْنِ

وَ الْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّ مِنْ عَجَمِ

﴿صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَسَلَّمَ﴾

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴-۱/ ۸۰ پی آئی وی، مؤرخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۲-۳/ ۲جنرل/ ۴-۸۴/ ۹۷۰-۳-۷، مؤرخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔۱/ اے ڈی (لائبریری)، مؤرخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ انتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱/ ۹۲، مؤرخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کے تفسیری معارف

اَلرَّحْمٰن کے لُغوی اور اِصطلاحی معانی

رحمٰن: ر ح م سے فَعْلَان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، عربی قواعد کی رو سے ''فَعْلَان'' ایسا اسم مصدر ہے جس میں فعل کی انتہائی کثرت اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جو اسماء اس وزن پر ہوں گے ان میں معنویت، انتہائی کثرت، فراوانی اور مبالغے کے ساتھ موجود ہوگی یعنی ان کے مادوں کا مفہوم ان اسماء میں نہایت شدت اور زیادتی کے ساتھ پایا جائے گا مثلاً فُرْقَان، اس میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کی صفت اپنے منتہائے کمال پر موجود ہے۔ یہ قرآن کا نام ہے اس لئے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کوئی کتاب حق و باطل میں واضح فرق پیدا نہیں کرسکتی۔ قُرْبَان، اس میں قرب کا معنی انتہائی افراط کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔ نُدْمَان، اس میں نادم اور شرمندہ ہونے کا معنی پایا جاتا ہے، لیکن اسم میں یہ صفت اس قدر شدت کے ساتھ موجود ہے کہ کوئی اور لفظ اس سے زیادہ معنیٰ ندامت کا اظہار نہیں کرسکتا۔ اسی طرح غَضْبَان ہے اس میں بھی غیض وغضب کا معنی انتہائی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ اس اسم سے بڑھ کر غضبناک ہونے کا مفہوم کوئی اور وزن ادا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اَلرَّحْمٰن بھی اسی وزن پر رَحْم سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی صاف طور پہ یہ متعین ہوا کہ ''انتہائی مہربانی فرمانے والا۔'' گویا لفظ الرحمٰن کا مفہوم یہ ہوا کہ رب العٰلمین وہ ہے جس کی ذات میں صفتِ رحمت کی اتنی کثرت، فراوانی اور غایت و نہایت

ہے کہ کوئی اور ہستی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اَلرَّحْمٰن کی اِسمی خصوصیت

صفتِ رحمت تو مخلوقات میں سے بھی لاکھوں افراد میں موجود ہے۔ لیکن یہ لفظ رحمٰن کی تکثیری خصوصیت ہے کہ یہ صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا خاصہ بن گیا ہے۔ رحم اور رحمت کے دیگر مشتقات کا اطلاق دوسرے افراد پر ہوسکتا ہے مگر رحمٰن اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں کہا جا سکتا۔ گویا یہ ذات حق کا علم خاص تصور ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے الرحمٰن کو اصطلاحاً باری تعالیٰ کی شانِ الوہیت کو نمایاں کرنے کے لئے بھی استعمال کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔(۱)

''فرما دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو جس نام سے بھی پکارتے ہو (سب) اچھے نام اسی کے ہیں۔''

اس آیت میں تعلیم یہ دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں۔ سو جس نام سے چاہو اسے پکارلو لیکن اسم ذات ''اَللّٰہ'' کا جو مترادف قرآن نے خود بیان کیا ہے وہ ''الرحمٰن'' ہے۔ جس سے اس لفظ کی اسمی خصوصیت اجاگر ہوتی ہے۔

اسی طرح صرف سورۂ مریم میں ہی کم و بیش ۱۷ مرتبہ ''الرحمٰن'' کا لفظ باری تعالیٰ کی الوہیت، خلاقیت اور ربوبیت کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ○ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ○ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ○(۲)

---

(۱) القرآن، بنی اسرائیل، ۱۷:۱۱۰

(۲) القرآن، مریم، ۱۹:۹۱-۹۳

[illegible] رحمٰن [illegible] اولاد [illegible]
(خدائے) رحمٰن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ (کسی کو اپنا) لڑکا بنائے ○ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی (آباد) ہیں (خواہ فرشتے ہیں یا جن و انس) وہ اللہ کے حضور محض بندہ کے طور پر حاضر ہونے والے ہیں○''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ وَ اَطِیۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ○(۱)

''حالانکہ بیشک تمہارا رب (یہ نہیں وہی) رحمان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو○''

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ الرَّحۡمٰنُ فَسۡئَلۡ بِهٖ خَبِیۡرًا○ وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اسۡجُدُوۡا لِلرَّحۡمٰنِ قَالُوۡا وَ مَا الرَّحۡمٰنُ اَنَسۡجُدُ لِمَا تَاۡمُرُنَا وَزَادَهُمۡ نُفُوۡرًا○(۲)

''پھر وہ (حسب شان) عرش پر جلوہ افروز ہوا (وہ) رحمان ہے (اے معرفتِ حق کے طالب) تو اس کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھ (بے خبر اس کا حل نہیں جانتے) ○اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم رحمان کو سجدہ کرو تو وہ (منکرینِ حق) کہتے ہیں کہ رحمان کیا (چیز) ہے کیا ہم اسی کو سجدہ کرنے لگ جائیں جس کا آپ ہمیں حکم دے دیں اور اس (حکم) نے انہیں نفرت میں اور بڑھا دیا○''

ان آیات میں ''الرحمٰن'' کا ذکر کتنے پیارے اور وجد انگیز انداز میں کیا گیا ہے۔ ''اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡئَلۡ بِهٖ خَبِیۡرًا'' کے الفاظ میں لفظ ''رحمٰن'' کی کتنی معنوی وسعت ہے

---

(۱) القرآن، طہ، ۹۰:۲۰

(۲) القرآن، الفرقان، ۲۵: ۵۹-۶۰

[illegible] ارشاد ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کی شانِ رحمانیت، عام لوگوں کو کیا معلوم ہو گی۔ اس کا اندازہ تو انھیں کو ہے جو شرابِ معرفت کا جام پی کر ماسوا سے بے خبر اور عرشِ معلی پر چمکنے والے نورِ ازل سے باخبر ہیں اور اسی کے حسنِ مطلق کے جلوے دیکھنے میں مست و بے خود ہیں۔ اگر تھوڑی سی بھی توجہ کی جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ جابجا ''الرحمن'' کا لفظ باری تعالیٰ کے اسم ذات کے بدل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت یہ ذاتِ حق کا صفاتی نام ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ○ (۱)

''کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کچھ اور خدا ٹھہرائے تھے جن کی عبادت کی جائے○''

متذکرہ بالا آیات کی روشنی میں یہ امر طے پا گیا کہ ''الرحمن'' صفاتی نام ہونے کے باوجود ذات باری تعالیٰ کے بیان کے لئے اس قدر مخصوص ومنفرد ہو گیا ہے کہ اس کا اطلاق کسی اور کے لئے جائز نہیں رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کئی صفاتی اسماء ایسے ہیں جو مخلوقات کے لئے بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً رحیم، کریم، رؤف، شہید، سمیع، بصیر وغیرہ لیکن خالق ومخلوق ہر ایک کے لئے ان کا استعمال ان کی حیثیت اور شان کے مطابق ہو گا۔ اسم ''رحمٰن'' کا خاصہ الٰہی ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس میں صفتِ رحمت جتنی کثرت، نہایت اور مبالغے کے ساتھ موجود ہے۔ وہ صرف خالقِ کائنات ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔ کسی مخلوق کے حق میں متصور نہیں ہو سکتی۔

اَلرَّحِیْم کے لغوی اور اِصطلاحی معانی

الرحمٰن کے بعد دوسرا اسم صفت الرحیم ہے۔ اس کا معنی بھی ''بہت رحم فرمانے والا'' ہے۔ یہ ''رحمت'' سے ''فَعِیْلٌ'' کے وزن پر اسم فاعل ہے اور اس میں بھی

(۱) القرآن، الزخرف، ۴۳: ۴۵

[illegible] الرحیم [illegible] میں صفت رحم کے اعتبار سے ہمیشگی اور دوام واستمرار کی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ الرحیم اصطلاحی اعتبار سے ''الرحمٰن'' کے مقابلے میں عام ہے۔ اس کا استعمال غیر خدا کے لئے بھی جائز ہے۔ قرآن حکیم میں اس کے استعمال کی چند صورتیں ملاحظہ ہوں:

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ (۱)

''یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے○''

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲)

''بیشک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والا مہربان ہے○''

اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۳)

''یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے○''

اسی طرح کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمت کا بیان ''الرحیم'' کے ذریعے کیا ہے۔ لیکن یہی لفظ جناب رحمۃ للعالمین ﷺ کی شان بیان کرنے کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

صفات کا اِشتراک اور اِختصاص

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنی بعض صفات کو انبیاء، اور دیگر مخلوقات کے لئے بھی ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات سے واضح ہوتا ہے۔

رؤف و رحیم

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ

---

(۱) القرآن، البقرہ، ۲: ۵۴

(۲) القرآن، البقرہ، ۲: ۱۴۳

(۳) القرآن، البقرہ، ۲: ۲۱۸

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ○(۱)

''بیشک تمہارے پاس تم میں سے (ایک باعظمت) رسول تشریف لائے، تمہارا تکلیف و مشقت میں پڑنا ان پر سخت گراں (گزرتا) ہے۔ (اے لوگو!) وہ تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب و آرزومند رہتے ہیں (اور) مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں○''

آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام رؤف اور رحیم نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کی توصیف میں بیان ہوئے ہیں۔ جبکہ لفظ رحمٰن کے لئے ایسا ممکن نہیں، حالانکہ تینوں صفات الٰہیہ ہیں اور ان کا معنی بھی ایک ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو صفاتِ الٰہیہ میں سے ہر ایک صفت کا اثبات مخلوق کے لئے جائز ہے اور نہ ایک صفت کا عدمِ اثبات۔ مختلف صفات کا معاملہ مختلف ہے، بعض صفاتِ الٰہیہ ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عام مخلوق سے بھی بعض کے لئے ثابت کی ہیں۔ اس امر کی مزید تائید ملاحظہ ہو۔

سمیع و بصیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًام بَصِيْرًا○(۲)

''بیشک ہم نے آدمی کو ملے ہوئے نطفے سے پیدا کیا کہ اسے جانچیں۔ پس اسے ہم نے سننے والا، دیکھنے والا بنادیا○''

یہاں قرآن نے انسان کا ''سمیع و بصیر'' کی صفات سے بہرہ ور ہونا بیان کیا ہے حالانکہ یہی صفات جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے لئے بیان ہوئی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ملاحظہ ہو:

---

(۱) القرآن، التوبہ، ۹: ۱۲۸

(۲) القرآن، الدہر، ۷۶: ۲

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○(١)

''بیشک اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے○''

شہید

قرآنِ حکیم میں آنحضرت ﷺ کے لئے یہ صفات نمایاں طور پر بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (٢)

''اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَابِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا○ (٣)

''پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گے○''

لیکن یہی صفتِ شہید جگہ جگہ باری تعالیٰ کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے:

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ (٤)

''پس اللہ ہی گواہ کافی ہے۔''

اِسی طرح حیات، علم، کلام، ارادہ، جمال، جود وسخا، عطا و غنا، ملک و حکمرانی، مدد و اعانت اور عدل و انتقام وغیرہا ایسی متعدد صفات ہیں جو قرآن و حدیث میں صراحت کے

---

(١) القرآن، النساء، ٤: ٥٨

(٢) القرآن، البقرہ، ٢: ١٤٣

(٣) القرآن، النساء، ٤: ٤١

(٤) القرآن، یونس، ١٠: ٢٩

[illegible] متصف [illegible] مخلوقات [illegible] کے لئے [illegible] استعمال [illegible] سکتی ہیں [illegible] لیکن [illegible] ربوبیت، معبودیت، رحمانیت اور مالکیت وغیرہا ایسی صفات ہیں جو صرف ذاتِ باری سے ہی مختص ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کے لئے ان کا ثبوت جائز نہیں۔ صفاتِ الٰہیہ میں بعض کا اشتراک اور بعض کا اختصاص اس فرق کی بنیاد پر ہے کہ کچھ صفتیں ''خاصے'' کے درجے میں ہوتی ہیں اور کچھ محض صفات کے۔ محض صفت دوسروں کے لئے ثابت ہو سکتی ہے لیکن خاصہ نہیں۔ جس طرح نبوت تمام انبیاء کی مشترک صفت ہے۔ لیکن ختم نبوت صرف حضور علیہ السلام کا خاصہ ہے۔ وہ کسی اور کے لئے ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ صفاتِ باری تعالیٰ اپنی ''اسی حیثیت'' کے اعتبار سے عام بھی ہیں اور خاص بھی۔ رحمٰن خاص ہے اور رحیم عام۔ اس لئے اگر خاصہ الٰہی کو کسی اور ذات کے لئے ثابت کریں گے تو شرک واقع ہو گا مگر صرف صفتِ الٰہی کو کسی اور کے لئے مانیں گے تو شرک تصور نہیں کیا جائے گا۔ ہاں یہ امتیاز ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ اشتراکِ صفات کی صورت میں دونوں کے لئے صفات کا اثبات اپنی اپنی نوعیتوں کے اعتبار سے بالکل مختلف ہو گا۔ مثلاً وہی صفت جب خالق کے لئے ثابت ہو گی تو وہ ذاتی، ازلی وابدی، واجب وقدیم، غیر محدود لامتناہی اور اس کی شان خالقیت کے لائق ہو گی اور جب کسی مخلوق کے لئے ثابت ہو گی تو عطائی، عارضی، ممکن وحادث، محدود ومتناہی اور اس کی شان مخلوقیت کے لائق ہو گی۔ اس فرق ماہیت کے ہوتے ہوئے شرک کا شائبہ نہیں رہتا۔ خلاصۂ بحث یہ ہوا کہ الرحمٰن خاصہ الٰہی ہے، باری تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رحمٰن نہیں کہا جا سکتا جبکہ الرحیم محض صفتِ الٰہی ہے اس کا اطلاق دوسروں کے لئے بھی جائز ہے۔

اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم میں معنوی امتیاز

رحمٰن اور رحیم کے لغوی اور اصطلاحی معنی سمجھ لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں اسم مبالغے کے ساتھ حق کی نشاندہی کرتے ہیں تو ان کو الگ الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا دونوں اسماء مختلف مرادی معنوں پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ الرحمٰن اور

[illegible] جدا
ہیں اور دونوں کو اس لئے انفرادیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر ایک کا مدعا و مفہوم علیحدہ علیحدہ ثابت ہو سکے۔ الرحمٰن اور الرحیم میں معنوی امتیاز کی چند وجوہ ہیں جو ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

اَلرَّحْمٰن : رحمتِ حق کا صفتی ظہور

اَلرَّحِیْم : رحمتِ حق کا فعلی ظہور

عربی قاعدے کی رو سے الرحمٰن ''فُعْلَان'' کے وزن پر واقع ہوا ہے۔ فعلان کا باب عام طور پر ایسی صفات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو محض حالت کی حیثیت سے کسی ذات میں موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً پیاسے کے لئے عَطْشَان، مست و بے خود کے لئے ''سُکْرَان''، غضبناک شخص کے لئے ''غَضْبَان''، پریشان و ششدر ہونے والے کے لئے ''حیران''، بہنے والے مائع کے لئے ''جریان'' اور سرکشی و بغاوت کے لئے ''طغیان''۔ الغرض یہ سب اسماء ایسی صفت کی نشاندہی کرتے ہیں جو باوجود کثرت و فراوانی کے ان کا بطور ''حالت'' واقع ہونا ظاہر کر رہی ہوں۔ یعنی عطشان سے کسی شخص کی حالتِ پیاس ظاہر ہو رہی ہے۔ سکران سے کسی کی مستی و بے خودی کی کیفیت ظاہر ہو رہی ہے۔ غضبان سے کسی کے غیض و غضب کی حالت کا پتہ چل رہا ہے۔ ''حیران'' سے کسی کی سراسیمگی اجاگر ہو رہی ہے۔ ''جریان'' سے کسی مائع کا بہاؤ معلوم ہو رہا ہے اور ''طغیان'' سے کسی کی بغاوت و سرکشی کی حالت و کیفیت کا علم ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر اسم کسی نہ کسی ذات کی ایسی صفت پر دلالت کرتا ہے جو اس کی حالت سے عیاں ہوتی ہے۔ اسی طرح الرحمٰن غایت و نہایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت پر اس انداز سے دلالت کرتا ہے کہ رحمت اس ذات کی حالت معلوم ہوتی ہے۔ یعنی رحمٰن وہ ذات ہے جو حالت رحمت سے متصف ہے۔ لیکن الرحیم فَعِیْلٌ کے وزن پر ہونے کی وجہ سے صرف حالت رحمت کو ہی نہیں بلکہ ذاتِ حق سے فعل رحمت کے صدور کو نمایاں کر رہا ہے، کیونکہ فعیل کا باب بالعموم صفات کے فعلی ظہور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''کریم'' اسے کہا جاتا ہے

جس سے [illegible] کا صدور ہو رہا ہو۔ ''علیم'' اسے کہا جاتا ہے جس سے علم ومعرفت کا فعلی ظہور ہو رہا ہو۔ ''حکیم'' اسے کہا جاتا ہے، جس کے ہر کام سے حکمت ودانائی کا صدور ہو رہا ہو۔ ''عظیم'' اسے کہا جاتا ہے جس سے عظمت وبزرگی کا صدور ہو رہا ہو۔ اسی طرح الرحیم کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ذات جس میں رحمت کا صرف صفتی ظہور ہی نہیں بلکہ فعلی ظہور بھی ہے۔ اس میں رحمت فراوانی کے ساتھ گویا الرحمٰن ذات حق کے رحمت ہونے کی دلیل تھا۔ الرحیم اس کے رحمت صادر کرنے کی دلیل بن گیا۔ ''الرحمٰن'' سے رحمت کا ظہور تھا۔ ''الرحیم'' سے رحمت کا صدور ثابت ہوگیا۔ چنانچہ دونوں اسماء کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ رحمانیت کے ذکر سے انسانوں کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ ذات والا صفات سراسر رحمت ہے اور رحیمیت کے ذکر سے یہ پتہ چل جائے کہ اس کا ہر کام بھی اول سے آخر تک رحمت ہے۔ رحمتِ حق کا صفتی ظہور قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے۔

وَ رَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُوالرَّحْمَۃِ۔ (۱)

''اور آپ کا رب بے نیاز ہے (بڑی) رحمت والا ہے۔''

اور رحمتِ حق کا فعلی ظہور اس آیت میں مذکور ہے۔

اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○ (۲)

''ان ہی لوگوں پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا بیشک اللہ بڑا غالب بڑی حکمت والا ہے ○''

پہلی آیت میں موصوفیت کا انداز ہے اور دوسری میں فاعلیت کا۔ پس الرحمٰن اور الرحیم میں یہی معنوی امتیاز کارفرما ہے۔

---

(۱) القرآن، الانعام، ۶: ۱۳۳

(۲) القرآن، التوبہ، ۹: ۷۱

اَلرَّحْمٰن : عمومِ رحمت کا بیان

اَلرَّحِیْم : خصوصِ رحمت کا بیان

رحمانیت کا فیضان اپنے دائرہ اثر کے لحاظ سے عام ہے اور رحیمیت کا خاص۔ **الرحمٰن** ایسی شان رحمت پر دلالت کرتا ہے جو موجودات عالم میں سے ہر ایک فرد کے لئے بلا استثنیٰ ثابت ہے اور **الرحیم** کی رحمت مومنوں کے لئے خاص ہے چونکہ **الرحمٰن** کا لفظ باری تعالیٰ نے اپنی شانِ خلاقیت و ربوبیت کے اظہار کے لئے اختیار فرمایا ہے اور اس کی خلاقیت و ربوبیت ساری کائنات کے افراد کے لئے عام ہے۔ کسی خاص طبقے، جنس ونوع اور گروہ کے لئے مخصوص نہیں۔ وہ ساری مخلوقات کا بلا استثنیٰ خالق و رب ہے۔ کوئی اسے مانے یا نہ مانے اس کی بارگاہ الوہیت میں کوئی سرِ تسلیم خم کرے یا نہ کرے۔ کوئی اس کی اطاعت و غلامی اختیار کرے یا بغاوت و سرکشی، کوئی بزعم خویش اس کا بندہ بنے یا کسی اور کا، کوئی اس سے اپنی حاجت بیان کرے یا نہ کرے، کوئی اس سے رحمت طلب کرے یا نہ کرے، اس کی خالقیت وربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر حال میں ہر فرد کو اپنی رحمت سے نوازے، ہر شخص کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے۔ ہر ایک کو روزی دے، ہر ایک کو بیماری سے شفا دے، ہر ایک کو تکلیف سے نجات دے اور ہر ایک کو ضروریاتِ حیات عطا کرے۔ پس اس کی خالقیت کا تقاضائے رحمت اس کی شانِ رحمانیت سے پورا ہو رہا ہے۔ وہ چونکہ رحمٰن ہے اس لئے اس کے خوانِ رحمت اور خرمنِ نعمت سے ہر مسلم و کافر برابر حصہ پا رہا ہے۔ اس کی عطائیں انسان کی طرح نہیں کہ اگر نوازا جانے والا شخص اپنے محسن کی نوازشوں کا انکار کر دے اس کی عنایات واحسانات کو فراموش کر دے اور اس کی رضا وخوشنودی کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دے تو محسن اپنی نوازشوں کا سلسلہ منقطع کر لیتا ہے۔ اور اپنی عنایات اس سے ہمیشہ کے لئے روک لیتا ہے لیکن خالقِ کائنات کی شانِ رحمانیت اس سے کہیں بلند وبالا ہے۔ روئے زمین پر کتنے انسان اس کی ہستی سے کھلا کفر کر رہے ہیں۔ اس کے وجود، اس کی توحید، اس کی الوہیت، اس کی خالقیت، اس کی ربوبیت اور اس کی رحمانیت کا برملا انکار کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے کسی

سے اپنی رحمتوں کو روک لیا ہو اور کسی کو اپنی نوازشوں سے محروم کر دیا ہو۔ اس کی رحمت کی یہ عمومیت اس کے نام الرحمٰن سے جھلک رہی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ○(۱)

''(وہ) نہایت رحمت والا (ہے) جو عرش (یعنی جملہ نظامہائے کائنات کے اقتدار) پر متمکن ہو گیا○''

یہاں استواء علی العرش کا بیان اس کی شانِ رحمانیت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح عرش ساری کائنات پر سایہ فگن ہے۔ اسی طرح الرحمٰن کے سرچشمہ رحمت سے ساری کائنات سیراب ہو رہی ہے، لیکن جو لوگ عام افراد سے ہٹ کر اپنے آقا کی خصوصی اطاعت اختیار کرتے ہیں، ہمہ وقت اس کی یاد اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے شب و روز اسی کی رضا کے مطابق بسر کرتے ہیں۔ ضروری تھا کہ ان کے لئے باری تعالیٰ کی رحمت مطلقہ میں سے خصوصی حصہ مقرر ہو اور وہ اپنے نیک اعمال کے بدلے میں زیادہ سے زیادہ رحمتِ الٰہی سے نوازے جائیں۔ پس ان مومنین و متقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ رحیمیت کو مخصوص کر دیا۔ اسی وجہ سے الرحیم، الرحمٰن کے مقابلے میں بالالتزام اہل ایمان اور صالحین کو رحمت سے نوازنے کی صفت کو ظاہر کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ○(۲)

''اور وہ مومنوں کے لئے رحیم ہے○''

---

(۱) القرآن، طہ، ۲۰: ۵

(۲) القرآن، الاحزاب، ۳۳: ۴۳

الرحمٰن : تمام انواعِ رحمت کو شامل ہے

الرحیم : قبولِ توبہ اور مغفرت کو شامل ہے

الرحمٰن کے اسم سے جس رحمت کا ظہور ہو رہا ہے وہ اپنی نوعیت و ماہیت کے اعتبار سے عام ہے۔ یعنی رحمت کی جتنی صورتیں اور مدارج و مراحل ہو سکتے تھے وہ سب رحمانیت کے دائرے میں شامل ہیں مگر الرحیم سے رحمتِ حق کا جو پہلو نمایاں ہوتا ہے وہ بالخصوص توبہ و مغفرت سے متعلق ہے۔ رحمت درحقیقت اس کائنات کی ضرورت ہے۔ موجوداتِ عالم کا ایک ایک ذرہ باری تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہے۔ ہر ہستی کی ضرورت کو پورا کرنا رحمت کہلاتا ہے۔ جیسے مخلوقات کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں، ویسے ہی رحمت کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ پیاسے کے لئے پانی رحمت ہے اور بھوکے کے لئے کھانا۔ بیمار کے لئے صحت رحمت ہے اور تھکے ماندے انسان کے لئے آرام۔ الغرض ہر ضرورت مند کے لئے اسی کی طلب اور ضرورت کے لحاظ سے رحمت کی نوعیت بدلتی جائے گی۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ضرورت تو کسی اور شے کی ہو لیکن رحمت کسی اور شے کو قرار دے دیا جائے چنانچہ ضرورت اور رحمت کے تعلق کو جانتے ہوئے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ضرورت کے تین درجے ہیں اور ہر درجے کی حیثیت کے مطابق رحمت بھی تین طرح کی ہے:

پہلا درجہ...... ایجاد...... کسی شے کو معرضِ وجود میں لانا۔

دوسرا درجہ...... ابقاء...... وجود میں لانے کے بعد اسے باقی رکھنا۔

تیسرا درجہ...... اِکمال...... وجود کو باقی رکھ کر اسے نقطۂ کمال تک پہنچانا۔

i- رحمتِ حق کا ایجادی پہلو

سب سے پہلے عدم سے وجود میں آنے کا مرحلہ آتا ہے۔ عدم سے وجود میں آنا ایک ضرورت ہے جو بغیر رحمت کے پوری نہیں ہوسکتی۔ جب رحمتِ حق کی پہلی نوع ایجاد کے ارادے سے عدم کی طرف متوجہ ہوئی تو عدم کو وجود مل گیا۔ انسان کو باری تعالیٰ اپنی

ایجادی رحمت کا یوں اظہار فرمایا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا○[1]

''بیشک آدمی پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا○''

قرآن انسان کو وہ وقت یاد دلا رہا ہے جب وہ عدمِ محض تھا اور رحمت الٰہی نے اسے وجود اور ظہور عطا کر دیا۔ اسی طرح ایک اور مقام پر انسان کو خطاب کرتے ہوئے تنبیہ کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ○ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ○ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ○[2]

''اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم سے نافرمان کر دیا○ جس نے تجھے وجود عطا کیا (یعنی پیدا کیا) پھر تجھے اعضاء و جوارح کے اعتبار سے سالم بنایا○ پھر تیرے اعضائے جسمانی میں تناسب و توازن پیدا کیا تجھے جس صورت میں چاہا ترکیب دیا○''

یہ تو انسان کو خلعتِ وجود عطا کرنے کی بات تھی۔ قرآن نے ایک اور مقام پر جملہ مخلوقات کو وجود عطا کرنے کا ذکر یوں کیا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى○[3]

''(موسیٰ نے) فرمایا ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کی○''

خلق کے بعد ہدایت کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ معرضِ وجود میں لانے کے بعد اسے باقی رکھنے اور کمال تک پہنچانے کے بھی کئی تقاضے ہیں۔ جن کے لئے انسانی سطح

(۱) القرآن، الدھر، ۷۶:۱

(۲) القرآن، الانفطار، ۸۲:۶۔۸

(۳) القرآن، طہٰ، ۲۰:۵۰

پر بالخصوص ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ابتداء ''جبلی''، پھر ''حسی''، پھر عقلی اور پھر ''وجدانی'' طور پر نصیب ہوتی ہے لیکن وجودِ انسانی کے تمام وسائل کا حتمی و قطعی حل انسانی استعداد میں ودیعت کی ہوئی ان نفسی ہدایتوں سے میسر نہیں آ سکتا۔ اس لئے اس کی ضرورتوں کی صحیح تکمیل کی خاطر انبیاء علیھم السلام کے ذریعے ہدایتِ الہامی عطا کی جاتی ہے تا کہ انسان کی کوئی حاجت بھی تشنہ تکمیل نہ رہے۔ گویا جب وجود عالم ظہور میں آ جاتا ہے تو اس کی بقاء خود ایک بنیادی ضرورت بن جاتی ہے۔

ii- رحمتِ حق کا اِبقائی پہلو

یہ شان رحمانیت کا وہ پہلو ہے جو عالم ہستی میں وجود کو باقی رکھتا ہے۔ اگر وجود باقی نہ رہے تو اس کی خلق کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا لہٰذا رحمتِ الٰہی کی دوسری نوع ابقاء کے ارادے سے اس وجود کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اُسے عالمِ خارج میں باقی رکھتی ہے۔

جس طرح عدم کا وجود میں آنا باری تعالیٰ کی ایجادی رحمت کا محتاج تھا۔ اسی طرح وجود کا باقی رہنا باری تعالیٰ کی ابقائی رحمت کا محتاج ہے۔ اگر رحمت حق کی یہ نوع عالم وجود کی طرف متوجہ نہ ہو تو وجودِ انسان بلکہ وجودِ کائنات ایک لحہ بھر کے لئے بھی باقی نہ رہ سکے۔ اگر موجوداتِ عالم اور نظامِ کائنات کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ذاتِ رحمٰن نے اپنی رحمت کا ظہور اس طرح کیا ہے کہ ہر ایک شے کو اس غرض سے پیدا کیا گیا کہ وہ انسانی بقاء کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مصروف رہے۔ اس کی شانِ رحمانیت کا پرتو ہر ایک ذرے میں دکھائی دے رہا ہے۔

زمین کی تخلیق...... رحمتِ الٰہی

قرآن حکیم نے زمین کی پیدائش، ساخت، جسامت، سطح اور اس کی تہہ کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے۔ تمام آیات اور ان کے مطالب یکسانیت کے ساتھ اسی امر پر زور دیتے ہیں کہ سارا نظام ارضی انسانی بقاء کے لئے رحمت الٰہی کی متشکل صورت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو:

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهَارًا وَ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ط اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ○ وَ فِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ط اِنَّ فِیْ ذَالِکَ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○(۱)

''اور وہی ہے جس نے (گولائی کے باوجود) زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں میں (بھی) اس نے دو دو (جنسوں کے) جوڑے بنائے (وہی) رات سے دن کو ڈھانک لیتا ہے۔ بیشک اس میں تفکر کرنے والوں کے لئے (بہت) نشانیاں ہیں۔ اور زمین (مختلف قسم کے) قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جھنڈ دار اور بغیر جھنڈ کے ان (سب) کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے اور (اس کے باوجود) ہم ذائقہ میں بعض کو بعض پر فضیلت بخشتے ہیں بیشک اس میں عقلمندوں کے لئے (بڑی) نشانیاں ہیں○''

ان آیات کے ایک ایک لفظ سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قدرت نے یہ سارا نظام انسانی بقا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہی حقیقت ایک اور مقام پر انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کی گئی ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

وَ لَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ○(۲)

''اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکن و تصرف عطا کیا اور ہم نے اس میں

---

(۱) القرآن، الرعد، ۱۳: ۳۔۴

(۲) القرآن، الاعراف، ۷: ۱۰

دریاؤں اور سمندروں کی تخلیق...... رحمتِ الٰہی

سمندر اور اس کے اندر جو کچھ موجود ہے۔ سب انسانی بقاء کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ یہ تخلیق بھی رحمت الٰہی کی بین دلیل ہے، ارشادِ ربانی ملاحظہ ہو:

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ تَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (۱)

''اور وہی ہے جس نے (فضا و بر کے علاوہ) بحر (یعنی دریاؤں اور سمندروں) کو بھی مسخر فرما دیا تاکہ تم اس میں سے تازہ (و پسندیدہ) گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے موتی (وغیرہ) نکالو جنہیں تم زیبائش کے لئے پہنتے ہو اور (اے انسان) تو کشتیوں (اور جہازوں) کو دیکھتا ہے جو (دریاؤں اور سمندروں کا) پانی چیرتے ہوئے اس میں چلے جاتے ہیں (اور یہ سب کچھ اس لئے کیا) تاکہ تم (دور دور تک) اس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو اور یہ کہ تم شکرگزار بن جاؤ○''

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ ۔ (۲)

''اور ان جہازوں (اور کشتیوں) میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں اٹھا کر چلتی ہیں۔''

دریاؤں اور سمندروں کے شکار بھی انسانی بقا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے

---

(۱) القرآن، النحل، ۱۶: ۱۴

(۲) القرآن، البقرہ، ۲: ۱۶۴

[illegible]

اُحِلَّ لَکُمۡ صَیۡدُ الۡبَحۡرِ وَ طَعَامُہٗ مَتَاعًا لَّکُمۡ وَ لِلسَّیَّارَۃِ۔(۱)

''تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے اور مسافروں کے فائدے کی خاطر حلال کر دیا گیا ہے۔''

حیوانات کی تخلیق ...... رحمتِ الٰہی

روئے زمین پر بسنے والی دیگر جاندار مخلوق حیوانات، مویشی اور چوپائے وغیرہ سب وجودِ انسانی کی بقاء کی خاطر معرضِ تخلیق میں آئے ہیں۔ یہ سب کچھ رحمتِ الٰہی کی ابقائی نوع کا ظہور ہے۔

وَ الۡاَنۡعَامَ خَلَقَہَا لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ○ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ○ وَ تَحۡمِلُ اَثۡقَالَکُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡہِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ اِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ○ وَ الۡخَیۡلَ وَ الۡبِغَالَ وَ الۡحَمِیۡرَ لِتَرۡکَبُوۡہَا وَ زِیۡنَۃً وَ یَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○(۲)

''اور اسی نے تمہارے لئے چوپائے پیدا فرمائے ان میں تمہارے لئے گرم لباس ہے اور (دوسرے) فوائد ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے (بھی) ہو ○ اور ان میں تمہارے لئے رونق (اور دلکشی بھی) ہے جب تم شام کو چراگاہ سے (واپس) لاتے ہو اور جب تم صبح کو (چرانے کے لئے) لے جاتے ہو ○ اور یہ (جانور) تمہارے بوجھ (بھی) ان شہروں تک اٹھا لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر جانکاہ مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے، بیشک تمہارا رب نہایت شفقت والا نہایت مہربان ہے ○ اور (اُسی نے) گھوڑوں اور خچروں اور گدھوں

(۱) القرآن، المائدہ، ۵:۹۶

(۲) القرآن، النحل، ۱۶: ۵-۸

کو پیدا کیا) تاکہ تم ان پر سواری کر سکو اور (وہ تمہارے لئے باعثِ) زینت بھی ہوں اور وہ (مزید ایسی بازینت سواریوں کو بھی) پیدا فرمائے گا جنہیں تم (آج) نہیں جانتے○''

اسی سورۃ میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ○ (۱)

''اور بیشک تمہارے لئے مویشیوں میں (بھی) مقامِ غور ہے ہم ان کے جسموں کے اندر کی اس چیز سے جو آنتوں کے (بعض) مشمولات اور خون کے اختلاط سے (وجود میں آتی ہے) خالص دودھ نکال کر تمہیں پلاتے ہیں (جو) پینے والوں کے لئے فرحت بخش ہوتا ہے○''

اِسی سورۃ میں مزید فرمایا گیا ہے:

وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَ یَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ ۙ وَ مِنۡ اَصۡوَافِہَا وَ اَوۡبَارِہَا وَ اَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ○ (۲)

''اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو (مستقل) سکونت کی جگہ بنایا اور تمہارے لئے چوپایوں کی کھالوں سے (عارضی) گھر (یعنی خیمے) بنائے جنہیں تم اپنے سفر کے وقت اور (دورانِ سفر منزلوں پر) اپنے ٹھہرنے کے وقت ہلکا پھلکا پاتے ہو اور (اسی اللہ نے تمہارے لئے) بھیڑوں اور دنبوں کی اون اور اونٹوں کی پشم اور بکریوں کے بالوں سے گھریلو استعمال اور (معیشت و تجارت میں) فائدہ اٹھانے کے اسباب بنائے (جو) مقررہ مدت تک (ہیں)○''

---

(۱) القرآن، النحل، ۱۶:۶۶

(۲) القرآن، النحل، ۱۶:۸۰

یہ وہ تمام [illegible] عالمِ مشینی کائنات بسا لی ہے۔ لیکن قدم قدم پر انسان کو ہر شے کی تخلیق جس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ سب موجوداتِ عالم صرف اور صرف انسانی بقا کی خاطر وجود میں لائے گئے ہیں، تاکہ انسان اپنے وجود کو باقی رکھنے اور مقاصدِ حیات کے حصول کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے ان سے استفادہ کر سکے۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان خلوت کی زندگی بسر کرے یا جلوت کی، تجرد کی زندگی بسر کرے یا ازدواجیت کی، الگ تھلگ جنگلوں میں رہے یا مہذب و متمدن معاشرے میں، ان ضروریات زندگی سے بے نیاز ہو کر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ باری تعالیٰ نے انسان کے مانگے بغیر اس کی ضرورتوں کی تکمیل کر دی ہے۔ یہ اس کی ابقائی رحمت کا پہلو ہے بلکہ ان موجودات و حیوانات میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کی بقا کا بھی ضامن ہے۔ یعنی یہ رحمت نہ صرف انسانوں کے لئے ہے بلکہ تمام مخلوقات کے لئے ان کی اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق یکساں ہے۔

شجر و حجر کی تخلیق ......رحمتِ الٰہی

صفحہ ہستی پر شجر و حجر کا وجود بھی انسان اور حیوانات کے لئے رحمت الٰہی ہے ،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○ (۱)

’’یہ وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے سر سبز درختوں سے آگ پیدا کر دی اب تم انہی میں سے آگ سلگاتے ہو○‘‘

اور سورہ نحل میں مذکور ہے:

---

(۱) القرآن، یس، ۳۶ : ۸۰

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ
جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ
يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○(۱)

''اور اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کردہ کئی چیزوں کے سائے بنائے اور اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور اس نے تمہارے لئے (کچھ) ایسے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (کچھ) ایسے لباس جو تمہیں شدید جنگ میں (دشمن کے وار سے) بچاتے ہیں اس طرح اللہ تم پر اپنی نعمت (کفالت و حفاظت) پوری فرماتا ہے تاکہ تم (اس کے حضور) سرِ نیاز خم کر دو○''

شمس و قمر کی تخلیق ...... رحمتِ الٰہی

باری تعالیٰ نے شمس و قمر اور ان کے نظاموں کو بھی انسان کے لئے وجود عطا کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تخلیق بھی انسان کے حق میں رحمتِ الٰہی ہے اور دیگر جاندار مخلوقات بھی ان سے اپنی بقا کا سامان حاصل کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ○(۲)

''اور اس نے تمہارے (فائدے کے) لئے سورج اور چاند کو (باقاعدہ ایک نظام کا) مطیع بنا دیا جو ہمیشہ (اپنے اپنے مدار میں) گردش کرتے رہتے ہیں اور تمہارے (نظامِ حیات کے) لئے رات اور دن کو بھی (ایک) نظام کے تابع کر دیا○''

---

(۱) القرآن، النحل، ۱۶: ۸۱

(۲) القرآن، ابراہیم، ۱۴: ۳۳

کائناتِ ارض و سما کی تخلیق ...... رحمتِ الٰہی

مختصر یہ کہ کائناتِ ارض و سماء میں جو کچھ بھی ہے سب وجودِ انسانی کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت ہے اور ان کی غرضِ تخلیق بھی انسان ہی کو فائدہ پہنچانا ہے۔

قرآن اس امر کی وضاحت یوں کرتا ہے:

اَ لَمْ تَرَوْا اَنَّ اللهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً۔(۱)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا ہے اور اپنی تمام نعمتیں اور رحمتیں تم پر ظاہراً اور باطناً پوری کر دی ہیں۔''

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کو وجود وظہور کی نعمت سے بہرہ ور کیا یہ اس کی رحمانیت کے ایجادی پہلو کا صدور تھا، پھر اس نے عالم ہستی میں انسانی وجود کو باقی رکھنے کے لئے تمام ضروریات پوری کر دیں اور انسانی منفعت کی خاطر ہزاروں نظام وضع فرمائے۔ یہ اس کی رحمانیت کے ابقائی پہلو کا صدور ہے۔

iii- رحمتِ حق کا اِکمالی پہلو

جس طرح کسی وجود کا معرضِ ظہور میں آنا یا کسی کا حالتِ عدم سے حالتِ وجود میں منتقل ہونا اس غرض سے تھا کہ وہ باقی رہے، کیونکہ بقا کے بغیر وجود کا کوئی مقصد نہیں۔ اسی طرح وجود کا باقی رہنا بھی فی نفسہ کوئی مقصد نہیں۔ بقاء تو محض اس لئے مطلوب ہوتی ہے کہ کمال حاصل ہو۔ وجود کو اپنی تکمیل کے لئے بقاء کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اصل ضرورت تکمیل ہے باقی سب مراحل اس کے لوازمات ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں صفات کو اکٹھا بیان کرنے کا مقصد از خود واضح ہے۔ چنانچہ اس غرض سے رحمتِ حق کی تیسری نوع اکمال

(۱) القرآن، لقمان، ۳۱: ۲۰

[illegible] پہنچا دیتی ہے۔ وجود کی یہ تکمیل تدریج وارتقاء کے اصول پر ہوتی ہے۔ کائنات کا ہر وجود اپنی بقا کے ساتھ تکمیل کے سفر میں گامزن ہے اور رحمتِ الٰہی کا التفات کائناتی موجودات کو کمال واتمام تک پہنچانے کے لئے ہمہ وقت قائم ودائم ہے۔ جس کا اظہار اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

لہٰذا شانِ رحمانیت کا امتیاز یہ ہے کہ انسان اور دیگر مخلوقات وجود میں آنے، باقی رہنے اور اپنے کمال کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ذاتِ رحمٰن کے محتاج ہیں۔ رحمت الٰہی کے بغیر نہ کسی کو کائنات میں وجود مل سکتا ہے، نہ کوئی وجود باقی رہ سکتا ہے اور نہ کوئی اپنی تکمیلی جدوجہد کو پورا کر سکتا ہے۔ چونکہ مخلوقاتِ عالم اپنی مختلف ضروریات کے پیش نظر ہر مرحلہ حیات پر ذاتِ رحمٰن کے محتاج ہیں۔ اس لئے اس کی رحمت بھی تمام انواع واقسام ضرورت کو شامل ہے تاکہ ہر کسی کو حسب حال رحمت حق کا حصہ مل سکے۔ یہ شان ''الرحمٰن'' کی تھی۔ لیکن ''الرحیم'' رحمت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے جو بخشش ومغفرت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنی کسی کو وجود وبقا اور کمال سے ہمکنار کرنا ''رحمانیت'' کا کام تھا۔ مگر کسی وجود کو اپنی بقا کے خلاف کارگزاریوں پر معاف کر دینا اور اس کے باوجود اسے باقی رکھنا ''رحیمیت'' کا کام ہے۔ اگر کوئی وجود ایسی خطائیں اور لغزشیں صادر کرے جس سے وہ باقی رہنے یا کمال پانے کے قابل نہ رہے بلکہ مٹا دیئے جانے کے لائق ہو جائے تو اس کی خطاؤں کو معاف کر کے اسے پھر مستحق نعمت بنا دینا رحیمیت کہلاتا ہے۔ اس گوشہ رحمت کا نام بخشش ومغفرت ہے۔ وصفِ رحیم اکثر وبیشتر قرآن حکیم میں امتیاز کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ کبھی یہ رؤف رحیم کے طور پر آیا ہے کبھی توابا رحیما کے طور پر اور کبھی غفور رحیم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ الغرض اس کے ساتھ بالعموم کوئی نہ کوئی ایسان وصف ضرور مذکور ہوتا ہے جس کا معنیٰ بالواسطہ یا بلاواسطہ

بخشش اور مغفرت پر دلالت کرے۔ اس سلسلے میں ارشاداتِ باری تعالیٰ ملاحظہ ہوں:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا○(۱)

''بیشک اللہ بڑا توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے○''

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا○(۲)

''بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے○''

لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا○(۳)

''وہ (اس وسیلہ اور شفاعت کی بنا پر) ضرور اللہ کو توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان پاتے○''

وَ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا○(۴)

''اور آپ اللہ سے بخشش طلب کریں، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے○''

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا○(۵)

''اس کی طرف سے (ان کے لئے بہت) درجات ہیں اور بخشش اور رحمت ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے○''

الغرض رحیمیت کا وصف اکثر و بیشتر ''غفوریت'' اور ''توابیت'' ایسے اوصاف کے ساتھ متصلاً بیان ہوا ہے، جس سے اس کی رحمت کی وہ خصوصی نوعیت متعین ہو جاتی ہے، جو اپنے دامن میں بخشش و مغفرت کی دولت رکھتی ہے۔

---

(۱) القرآن، النساء، ۴: ۱۶

(۲) القرآن، النساء، ۴: ۲۳

(۳) القرآن، النساء، ۴: ۶۴

(۴) القرآن، النساء، ۴: ۱۰۶

(۵) القرآن، النساء، ۴: ۹۶

اَلرَّحمٰن : دنیا کی رحمت کا آئینہ دار ہے

اَلرَّحِیم : آخرت کی رحمت کا آئینہ دار ہے

مفسرین نے بالعموم الرحمٰن کو ''رَحمَانُ الدُّنیا وَالْآخِرَۃِ'' اور الرحیم کو ''رَحِیمُ الْآخِرَۃِ'' کے طور پر واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک رحمانیت دنیا و آخرت دونوں کی رحمت کو شامل ہے اور رحیمیت صرف آخرت کی رحمت کو اور اسی امتیاز کی بنا پر رحمٰن میں مبالغہ رحمت رحیم کی نسبت شدید تصور کیا جاتا ہے، لیکن بعض نے رحمٰن کو رحمتِ دنیا سے اور رحیم کو رحمتِ آخرت سے مخصوص کیا ہے، بہر حال رحمانیت میں دنیا کی رحمت کا پہلو غالب ہے، کیونکہ یہی تصور عمومِ رحمت کے پہلو کی بھی تائید کرتا ہے۔ دنیا کی رحمت مسلم و غیر مسلم سب کے لئے برابر فراوانی کے ساتھ صادر ہوتی ہے، جب کہ آخرت میں حصۂ رحمت پانے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ایماندار بندے خصوصیت کے ساتھ مستحق ہوں گے لہٰذا الرحمٰن کا اسم صفت ہر مومن و کافر کو اس حیاتِ دنیوی میں رحمت ایزدی کا مژدۂ جانفزا سنا رہا ہے اور الرحیم کا اسمِ صفت آخرت میں مومنین کو رحمت خداوندی کی خوشخبری سنا رہا ہے۔

امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا قول

الرحمٰن اور الرحیم کے درمیان وجہ امتیاز بیان کرنے کے سلسلے میں امام عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول نہایت لطیف نکتے پر مشتمل ہے، وہ فرماتے ہیں:

اَلرَّحمٰنُ اِذَا سُئِلَ اَعطٰی وَالرَّحِیمُ اِذَا لَم یُسأَلُ یَغضَبُ۔ (۱)

''رحمٰن وہ ہے کہ جب بھی اس سے مانگا جائے عطا کرتا ہے اور رحیم وہ ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔''

رحمانیت کا یہ معنی مزید کسی دلیل کا محتاج نہیں کیونکہ ذات باری تعالیٰ کی شان

---

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱:۲۰

ی یہ ہے کہ جب [illegible] قبول [illegible] بارگاہ [illegible] سوالی [illegible] ہاتھ پھیلاتا ہے [illegible] اسے نامراد واپس نہیں لوٹاتی، قرآن کا ارشاد ہے:

وَاٰتٰکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مَا سَاَلۡتُمُوۡهُ۔(۱)

''اور اس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرما دی جو تم نے اس سے مانگی۔''

ضرورت اور طلب پر عطا کرنا تو اس کی شانِ رحمانیت میں تھا ہی ورنہ اس کے بغیر اس حکم کا بھی کوئی جواز نہ تھا کہ:

اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ۔(۲)

''میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے۔''

لیکن رحیمیت اس کی رحمت کے ایک اور تقاضے کو اُجاگر کر رہی ہے کہ اس ذات کی سخاوت اور اپنے بندوں کے لئے شفقت وعنایت کا عالم یہ ہے کہ اگر کوئی اس سے سوال نہ کرے تو وہ ناراض ہو جاتی ہے، یعنی اس کی عطا اور رحمت ہمہ وقت سائل کی تلاش میں ہے۔ اقبال کا یہ شعر رحمتِ حق کے اس پہلو کو خوب اُجاگر کرتا ہے:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی مفہوم کی ایک حدیث مروی ہے: ''میں تو دعا مانگنے والے کی التجاؤں کو، جب وہ مجھ سے دعا مانگے قبول کرتا ہوں پس (بندوں کو بھی) چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں۔''

قال قال رسول الله ﷺ انه من لم يسال الله يغضب عليه۔(۳)

---

(۱) القرآن، ابراہیم، ۱۴: ۳۴

(۲) القرآن، البقرہ، ۲: ۱۸۶

(۳) ۱۔ ترمذی، الجامع الصحیح، ۵: ۴۵۶، ابواب الدعوات، رقم: ۳۳۷۳

۲۔ ابن ماجہ، السنن، ۲: ۱۲۵۸، کتاب الدعا، رقم: ۳۸۲۷

[illegible] شخص [illegible] سوال نہیں [illegible]
غضب آتا ہے۔"

یہ اس کی شانِ کریمی کی انتہا ہے۔ اگر وہ ذات ترکِ سوال پر ناراض ہوتی ہے تو یقیناً کثرتِ سوال پر زیادہ خوش ہوتی ہوگی۔ لیکن انسانوں کی عطا کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر ان سے زیادہ مانگا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں، بلکہ دینے کے بجائے انہیں اس بات پر خوشی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص زیادہ دیر تک حاجت مندی میں مبتلا رہ کر اس کے دروازے کے چکر لگاتا رہے اور مسلسل احساسِ محرومی کا شکار رہے، مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کا مانگنا اور اسے اس کا عطا کر دینا خوش کرتا ہے۔ بقول شاعر ؎

اللہ يغضب ان تركت سواله
و بنی آدم حين يُسال يغضب

"اللہ تعالیٰ سے اگر سوال نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور اگر بنی آدم سے سوال کیا جائے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔"

اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم دونوں کو اکٹھا بیان کرنے کا مقصد

الرحمٰن اور الرحیم کے معنوی امتیازات کو سمجھنے کے بعد ان دونوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنے کا مقصد از خود واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم یہاں تلخیص کی صورت میں اس امر پر مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کیونکہ ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ رحمٰن، رحیم کی نسبت زیادہ مبالغے کے ساتھ رحمت پر دلالت کرتا ہے۔

مستزاد یہ کہ لفظ رحمٰن میں لفظ رحیم کے مقابلے میں زیادہ حروف استعمال ہوتے ہیں اور عربی ادب کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ زیادتی حروف زیادتی معنی پر بھی دلالت کرتی ہے۔ یعنی زیادہ حروف پر مشتمل الفاظ اسی معنی میں کم حروف پر مشتمل الفاظ کے مقابلے میں زیادہ معنوی وسعت رکھتے ہیں، لہٰذا اس کی ضرورت کیوں ہوگی کہ ایک ایسے وصف یعنی الرحمٰن کو جو زیادہ رحمت پر محیط ہے پہلے بیان کر دینے کے بعد پھر دوسرے

یعنی [illegible] کیا گیا اور اگر دونوں کو ہی بیان کرنا مقصود تھا تو اس ترتیب تقدیم وتاخیر کے ساتھ کیوں؟

1- رحمٰن و رحیم دونوں کو اکٹھا بیان کرنے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ ذات حق میں رحمت کا صرف صفتی ظہور ہی نہیں بلکہ فعلی ظہور بھی ہے۔ ہر چند کہ رحمٰن، رحیم کے مقابلے میں زیادہ معنیٰ رحمت پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہاں یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ذات کثرت کے ساتھ صفتِ رحمت کی حامل تو ہے لیکن معلوم نہیں کہ وہ رحمت اس سے اسی قدر فعلاً بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں تو رحمٰن کے بعد رحیم کے لفظ نے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ ہستی باری تعالیٰ کی رحمت محض اس کی صفت اور حالت ہی نہیں بلکہ ہر لحہ عالم وجود اس کی رحمت سے بالفعل فیض یاب بھی ہو رہا ہے۔

2- دونوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ رحمانیت کی عمومی رحمت جو جمیع خلق کو بلا استثنیٰ محیط ہے، مومن وکافر دونوں کے لئے یکساں ہے اس یکسانیت کے پیش نظر کہیں مومنین ومتقین مایوس نہ ہو جائیں کہ اگر کفار ومشرکین بھی ہمارے برابر حصہ رحمت پائیں گے تو ہمیں اطاعت وغلامی حق کا کیا صلہ ملا۔ اس سوال کا جواب پہلے ہی دے دیا گیا کہ بیشک سب مخلوق بلاامتیاز ربِ کائنات کے چشمہ رحمانیت سے فیض یاب ہو رہی ہے لیکن مومنین ومتقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحیمیت کی بارگاہ سے خصوصی رحمت کا اہتمام بھی کر رکھا ہے۔

3- تیسرا مقصد یہ ہے کہ شانِ رحمانیت کے بیان سے وجود و بقا اور کمال کے ہر مرحلے پر رحمتِ حق کے میسر آنے کا وعدہ تو ہو گیا تھا، لیکن گناہگار وخطا کار پریشان تھے کہ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور اپنی ہی بقا وکمال کے خلاف کوئی عمل صادر کر بیٹھیں تو کہیں رحمتِ حق کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ بارگاہِ رحیمیت سے ندا آئی کہ نہیں نہیں، خطا کاروں کے لئے بھی رحمتِ حق نے اپنی بخشش ومغفرت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ وہ ذات معاف کر کے اپنی رحمت بحال رکھے گی صرف اس سے صفائی قلب کے ساتھ معافی مانگنا

[illegible] بلکہ اللہ کی رحمت خاص [illegible] نیت کرکے توبہ [illegible] معافی مانگنے والے گناہگار کے [illegible] زیادہ
قریب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ پرہیزگاروں کے مقابلے میں زیادہ ضرورت مند ہوتا ہے۔ سیدنا غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی ﷺ کے مکشوفات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اهل الطاعات يذكرون النعيم و اهل العصيان يذكرون الرحيم۔(۱)

''عبادت کرنے والے جنت کو یاد کرتے ہیں اور گناہگار رب کی رحمت کو یاد کرتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر ارشاد منقول ہے:

انا اقرب الى العاصي اذا فرغ من العصيان۔(۲)

''جب گناہگار گناہ سے دور ہو جاتا ہے تو میں اُس کے زیادہ قریب ہو جاتا ہوں۔''

4- دونوں اوصاف کو اکٹھا کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ شان رحمانیت چونکہ بندوں کو زیادہ تر دنیا میں رحمت سے نوازنے کا مژدہ سنا رہی تھی۔ اس لئے اس سے کہیں بندے یہ تاثر نہ لیں کہ آخرت میں جب لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔(۳)

''کہ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ کی، جو ایک ہے قہر والا ہے۔''

کا اعلان ہوگا تو ہم کہاں جائیں گے۔ کیونکہ رحمتِ حق کے بغیر تو کسی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا۔ چنانچہ شانِ رحیمیت نے انسانوں کو اس مایوسی سے بچالیا، کہ تم خود کو آخرت کے لئے تیار کرو، رحمتِ حق وہاں بھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑے گی کیونکہ ربِ ذوالجلال صرف

---

(۱) غوث الاعظم، الرسالہ: ۶۰

(۲) غوث الاعظم، الرسالہ: ۶۲

(۳) القرآن، المومن، ۴۰: ۱۶

رحمٰن الدنیا ہی نہیں رحمٰن الآخرۃ بھی ہے۔

5- دونوں اوصاف کو اکٹھا بیان کرنا اس وجہ سے بھی تھا کہ لوگ آداب بندگی سے بہرہ ور ہو جائیں، کیونکہ رحمانیت کی شان یہ تھی کہ ذاتِ حق اپنے بندوں کو ہر وہ چیز عطا کرتی رہے جس کی انہیں ضرورت اور طلب ہو اور بغیر مانگے بھی عطا کرنا رحمانیت کا تقاضا تھا۔ اس بے پایاں عطا سے لوگ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ جب سب کچھ ازخود مل جاتا ہے تو اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ رحیمیت باری نے بنی نوع انسان کو متنبہ کر دیا کہ از خود عطا کرنا میری شان ہے مگر مجھ سے مانگنا تمہارا فرض ہے۔ اگر مجھ سے نہیں مانگو گے تو میری ناراضگی کے مستحق ٹھہرو گے۔ میں تمہیں دیتا رہوں اور تم ہر گھڑی مجھ سے مانگتے رہو۔ اس طرح رحمانیت ورحیمیت کی دونوں شانوں کے ظہور سے تمہارا تعلق بندگی پختہ ہو گا اور مجھے دینے میں خوشی ہوگی۔

6- دونوں اسماء کا یکے بعد دیگرے بیان کرنا اس وجہ سے بھی تھا کہ رحمتِ حق کے امیدوار و طلبگار مطمئن رہیں کہ اس کے خزانۂ رحمت میں کوئی کمی نہیں۔ جس طرح وہ اپنی صفتِ رحمت کو بار بار مختلف عنوانات کے تحت بیان کر رہا ہے، اسی طرح وہ ضرورت مندوں پر اُن کے حسب حال رحمت بھی بار بار کرے گا۔ اس کی رحمت مختلف صورتوں میں مسلسل ہوتی رہے گی۔ مبرد کا قول اسی امر کی تائید کرتا ہے کہ "**هو انعام بعد انعام وتفضل بعد تفضل**" (اس کا انعام اور فضل مسلسل ہوتا رہتا ہے۔) یہ ان حکمتوں میں سے چند ایک تھیں جن کی بنا پر خالقِ کائنات نے خود کو بیک وقت الرحمٰن کے وصف سے بھی متعارف کرایا اور الرحیم کے وصف سے بھی۔

صفتِ رحمت کی تخصیص کیوں!

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ باری تعالیٰ لاتعداد صفات و کمالات سے بہرہ ور ہے اور ہر لمحہ کائنات میں اس کی مختلف صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔

وہ خالق و مالک بھی ہے، رب و مستعان بھی، علیم وخبیر بھی، سمیع وبصیر بھی، حفیظ

وکیل بھی ہے، علی و کبیر بھی، لطیف و حلیم بھی ہے، عزیز و جبار بھی ہے، مجید و قہار بھی، شہید وحمید بھی ہے، حی و ممیت بھی، قوی و قیوم بھی ہے اور رشید و صبور بھی۔ الغرض وہ ذات ''كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ'' کی مصداق ہے۔ ہمہ وقت اس کے اَوصاف واَفعال اس کی ہستی کی مختلف شانوں کو اجاگر کر رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تسمیہ میں شانِ اُلوہیت کو جن دو اوصاف سے متصف کیا گیا وہ دونوں شان رحمت پر مبنی تھے۔ دیگر اوصاف وکمالاتِ الٰہیہ میں سے کسی اور کو کیوں نہ منتخب کیا گیا؟ صرف صفتِ رحمت کی تخصیص کس مصلحت پر مبنی تھی؟

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات وکمالات میں سے رحمت، ایک ایسی صفت ہے جو اس کی تمام شانوں، حیثیتوں اور اوصاف وافعال پر محیط ہے۔ یعنی اس کی کوئی صفت اور کوئی فعل بھی رحمت سے خالی نہیں۔ اور یہی ان ارشاداتِ ربانی کا معنی ہے:

رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ۔ (۱)

''تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے۔''

وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ۔ (۲)

''اور میری رحمت ہر چیز پر وسعت رکھتی ہے۔''

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا۔ (۳)

''ہمارا رب جس کی رحمت اور علم ہر شے پر حاوی ہے۔''

جس طرح کائنات میں رونما ہونے والی کوئی حرکت علمِ الٰہی سے خارج نہیں ہوسکتی اسی طرح کائنات میں صادر ہونے والا کوئی امر بھی رحمتِ الٰہی سے خالی نہیں ہو

(۱) القرآن، الانعام، ۶: ۱۴۷

(۲) القرآن، الاعراف، ۷: ۱۵۶

(۳) القرآن، المؤمن، ۴۰: ۷

[illegible] چنانچہ [illegible] فعل [illegible] بھی [illegible] ہوگا وہ خالق [illegible] بہرصورت رحمت ہوگا خواہ مخلوق خدا اپنی دانست میں اسے رحمت سمجھے یا نہ سمجھے۔ چونکہ ہر فعل الٰہی اور وصفِ ربوبیت کی اصل اور حقیقت رحمت ہی تھی۔ اس لئے اسی کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کردیا اور باقی صفات وکمالات کا لفظاً ذکر نہ کیا گیا۔ جب الرحمن اور الرحیم دونوں اسماء کی معنوی وسعتوں نے رحمت الٰہیہ کی ہر نوع، ہر درجہ اور ہر شکل وصورت کو بیان کر دیا تو ذات حق کی تمام صفتی اور فعلی شانیں ازخود بیان ہو گئیں۔ الگ الگ نام لے کر مزید کسی کا بیان کیا جانا ضروری نہ رہا۔ اگر یہاں یہ گمان پیدا ہو کہ زندگی میں صرف راحتیں ہی نہیں ہوتیں ہزاروں دکھ و آزار، مصائب و آلام اور آفات وشدائد کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آخر ان پریشانیوں اور تکلیفوں کو کیوں رحمت تصور کرلیا جائے اور اگر انسانی زندگی کے یہ پریشان کن افعال بھی مشیت الٰہی کے باعث ہیں تو پھر اسے ہر حال میں رحمان ورحیم کیسے مان لیا جائے۔ اس الجھن کو صحیح طور پر حل کرنے کے لئے رحمت کے معنی ومفہوم اور رحمت باری تعالیٰ کے حقیقی وواقعی تصور کو سمجھنا ضروری ہوگا۔

رحمت کا معنی ومفہوم

رحمت عام طور پر مہربانی کو کہتے ہیں لیکن اس کا اصل معنی بھلائی اور احسان کے لئے کسی کی طرف دل کا جھکنا اور نرم ہونا ہے۔ آئمہ لغت اور علماء ومحققین نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے:

الرحمة رقّة تقتضی الإحسان إلى المرحوم۔(۱)

''رحمت دل کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جو مرحوم (جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کا تقاضا کرے۔''

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اسی معنی کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) امام راغب اصفہانی، المفردات: ۳۴۷

الرحمة رقة القلب و انعطاف يقتضي التفضل و الاحسان (۱)

''رحمت درحقیقت اُس کیفیت کا نام ہے جو دل پر رقت اور نرمی کی صورت میں پیدا ہوتی ہے اور کسی مستحق کی طرف بھلائی اور احسان کے ساتھ پیش آنے کا تقاضا کرتی ہے۔''

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ رحمت دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک دل کی نرمی و رقت اور دوسرے فضل و احسان، یہاں ایک نکتہ انتہائی اہم ہے کہ رقت قلب اور ارادۂ احسان دونوں تبھی ممکن ہیں کہ خارج میں کوئی فرد پریشان اور خستہ حال موجود ہو۔ اس کی پریشانی، تکلیف اور خستہ حالی دیکھی نہ جا سکے۔ اس کی حالت دیکھتے ہی دیکھنے والے کے دل میں اس کے لئے ایسی نرمی، رقت اور ہمدردی پیدا ہو، جو اُس پر احسان کرنے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے کا سبب بن جائے۔ اسی قلبی کیفیت کا نام جو بالآخر فعلِ احسان پر منتج ہوتی ہے ''رحمت'' ہے۔ لیکن بہر صورت اس رحمت کا محرک کسی کی پریشانی، خستہ حالی یا ضرورت مندی ہوتی ہے لہٰذا مصائب و آلام جو ظاہراً رحمت کے منافی معلوم ہوتے ہیں، فی الحقیقت چھپے ہوئے جذبۂ رحمت کے جوش میں آنے اور اس کے بالفعل صادر ہونے کا حقیقی سبب بن جاتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ جب رحمت رحیم کی اس صفت اور فعل کا نام ہے، جس کا ظہور وصدور کسی مصیبت زدہ کی ایسی تکلیف کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جس کا ازالہ اس رحمت کا مقصد ہو تو پھر ایسی تکلیف یا مصیبت کو مطلقاً منافی رحمت کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟ جو حالت خود رحمت کے ظہور اور صدور کا باعث ہو، زحمت نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ کیفیت اور حالت جسے ہم بعض ظاہری عوارض کی بنا پر مصیبت اور تکلیف سمجھ رہے ہیں، موجود نہ ہوتی تو اس کے ازالے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صاحبِ رحم، شفقت وعنایت اور فضل و احسان کے ارادے کے ساتھ کبھی بھی بالالتزام متوجہ نہ ہوتا اور اُس خصوصی شفقت واحسان کے بغیر کوئی وجود پروان نہ چڑھتا، کسی کو کمال نصیب نہ ہوتا۔ یہ سب کچھ اسی کیفیت کے باعث ہے، جسے ہم نے زحمت سمجھا، لیکن وہ درحقیقت رحمت

---

(۱) بیضاوی، انوارالتنزیل، ۱:۸

تھی کم فہمی [illegible] کے منافی رحمت تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک شیر خوار بچہ بھوک کی شدت محسوس کر کے روتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے، چیختا اور چلاتا ہے۔ اس کی دانست میں یہ وقت یقیناً سخت تکلیف اور مصیبت کا وقت ہو گا، جس کا اظہار اس کی ظاہری حالت سے بھی ہو رہا ہے، لیکن اس ناسمجھ کو کیا خبر کہ اس کی یہی حالت، احساس اور ردِ عمل جسے وہ اپنے حق میں زحمت تصور کرتا ہے حقیقت میں اس کے لئے رحمت ہے۔ جس نے اس کی ماں کو شفقت ومحبت کے ارادے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ کر دیا اور اس نے اسے سینے سے لگا کر نہ صرف اس کے ظاہری عوارض کو دور کر دیا بلکہ اس کی صحت وتندرستی اور پرورش کی تکمیل کا باعث بھی ہوگئی۔

ذاتِ باری تعالیٰ اور مفہومِ رحمت

رحمت کے متذکرہ بالا معنی ومفہوم کو سمجھنے کے بعد یہ امر وضاحت طلب ہے کہ جب رحمت ''رقتِ قلب اور ارادۂ احسان'' کا نام ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے اثبات رحمت کیسے جائز ہوا، کیونکہ وہ ذات تو دل کے جھکنے، نرم ہونے اور اس طرح کی تمام صفات حدوث سے پاک ہے۔ بیشک دل کا ہونا اور رقت ولرزہ ایسی کیفیات اس کی شان کے لائق نہیں لہٰذا ذاتِ حق کی رحمت سے مراد فضل واحسان کے ساتھ کسی کی طرف اللہ تعالیٰ کا متوجہ ہونا ہو گا۔ کیونکہ رحمت کا اطلاق دونوں صورتوں پر ہو سکتا ہے ایک یہ کہ کسی کے لئے دل میں نرمی ورقت پیدا ہو یعنی اس پر بھلائی کرنے کا جذبہ اور خواہش دل میں موجزن ہو لیکن عملاً بھلائی اور احسان کر سکنے کی استطاعت نہ ہو۔ اس حالت میں احسان کا صدور تو نہیں ہو سکا لیکن دل رقت کے ساتھ احسان کرنے کی خواہش ضرور کرتا رہا۔ مخلوق میں بسا اوقات ایسی رحمت کی صفت پائی جاتی ہے۔ کئی انسان دل سے کسی کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے۔ یہ خوبی بھی بہر حال بلا اختلاف رحمت کہلاتی ہے۔

وہ رحمت جو صرف حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہے وہ انفعالِ قلب اور رقت وغیرہ سے پاک ہے۔ وہ جس پر رحم کرنا چاہتی ہے، اس کی طرف فضل واحسان کے ارادے سے متوجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا مجرد ارادۂ فضل و احسان سے باری تعالیٰ کے التفات وتوجہ کو اس کی رحمت کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ اسی امتیاز کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قد تُستعمل تارةً فی الرقّة المجردةِ و تارةً فی الإحسان المجردِ عن الرقَّةِ نحو: رحم اللہ فلانا، وإذا وصف به الباری فلیس یراد به إلا الإحسان المجرد دون الرقّة و علی هذا روی أن الرحمة من اللہ اِنعام و افضال ومن الآدمیین رقّة و تعطف و علی هذا قول النبی ﷺ ذاکراً عن ربه أنه لما خلق اللہ الرحم قال له:'' أنا الرحمن و أنت الرحم، شققت اسمک من اسمی فمنْ وصلک وصلتُه و من قطعک قطعته'' فذلک إشارةٌ إلی ما تقدم و هو أن الرحمة منطویة علی معنیین: الرقة والاحسان فرکز تعالی فی طبائع الناس الرقة و تفرد بالإحسان''۔(۱)

''کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں، خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو جیسے ''اللہ اس پر رحم فرمائے'' جب اس کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہو گا جیسا کہ مروی ہے کہ ''اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام وفضل سے عبارت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقت اور شفقت کے معنی میں آتی ہے۔ اسی معنی میں حضور ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا: میں رحمٰن ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے پس جو تجھے ملائے گا (صلہ رحمی کرے گا)

(۱) اصفہانی، المفردات: ۳۴۷

یں بھی اسے ملاؤں گا اور جو اسے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کر دوں گا۔

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کر دی ہے اور احسان کو اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔''

مذکورہ بالا تصریح سے یہ امر واضح ہو گیا کہ مخلوقات عالم پر محض فضل واحسان کے ارادے سے متوجہ ہونا باری تعالیٰ کی رحمانیت و رحیمیت ہے۔ اور رقتِ قلب کے ساتھ کسی پر احسان کے ارادے سے متوجہ ہونا انسانوں کی رحیمیت ہے۔

رحمتِ حق کا حقیقی تصور

رحمتِ حق کے حقیقی تصور کو اُس کی آفاقیت کے حوالے سے جانا جا سکتا ہے۔ پوری کائنات میں کارفرما نظامِ قدرت کا ایک ایک گوشہ رحمتِ باری تعالیٰ کی منہ بولتی تصویر ہے۔ عالمِ ہستی میں ظہور پذیر ہونے والے اَحوال وواقعات کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں جو درحقیقت رحمتِ حق پر دلالت نہ کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی ذات کی نسبت واضح طور پر لزومِ رحمت کا حکم صادر فرمایا:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (۱)

''اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم فرما لی ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (۲)

''آپ (ان سے شفقتاً) فرمائیں کہ تم پر سلام ہو تمہارے رب نے اپنی ذات (کے ذمۂ کرم) پر رحمت لازم کر لی ہے۔''

---

(۱) القرآن، الانعام، ۶: ۱۲

(۲) القرآن، الانعام، ۶: ۵۴

[illegible] اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہتی کہ افعالِ الٰہی میں سے کوئی بھی فعل خلافِ رحمت ہو، خواہ وہ ظاہراً عذاب ہی کیوں نہ دکھائی دے رہا ہو۔ اس لحاظ سے کائناتِ ہست و بود پر نظر ڈالی جائے تو رحمت الٰہی کی دو صورتیں نظر آتی ہیں: ''حسی رحمت اور معنوی رحمت''، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَ اَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً۔(۱)

''اور اللہ نے تم پر حسی وظاہری طور پر بھی اور معنوی و باطنی طور پر بھی اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔''

رحمتِ حق کی حسّی صورت

اس سے مراد حیاتِ انسانی کے وہ اوصاف واحوال ہیں جو ظاہراً و باہراً ہر ایک کو رحمت معلوم ہوتے ہیں، ان کی افادیت میں کسی کو شک نہیں، ہر وجود بلاامتیاز ربّ العالمین کی ان کھلی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ یہ باری تعالیٰ کے وہ ظاہری انعامات و احسانات ہیں جن کا کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ انسانی خلقت کے اندر غور فرمائیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ نے انسان کو عالم آب وگل میں وجود عطا کر کے اس دنیا کی رنگینیوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کتنی جسمانی نعمتوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ اس نے انسان کو سب سے پہلے متوازن اور معتدل اعضاء پر مشتمل ایک ایسا خوبصورت وجود بخشا، جسے تمام حسی مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ○(۲)

''بیشک ہم نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا○''

یہی وجہ ہے کہ انسان دیگر جاندار مخلوقات کو دیکھ کر احساس کمتری کا شکار نہیں

---

(۱) القرآن، لقمان، ۳۱: ۲۰

(۲) القرآن، التین، ۹۵: ۴

ہوتا۔ اُسے اپنے بڑے [illegible] کا [illegible] عالم ہے [illegible] آنکھیں عطا کیں [illegible] سے لطف آشنا ہو سکے، ورنہ مناظرِ حسن و جمال کی لذتوں سے نا آشنا رہتا۔ اُسے کان عطا کئے کہ وہ سن سکے، ورنہ صوتی اِحساسات سے نابلد ہو کر اس کی زندگی کا آدھا حسن جاتا رہتا۔ پھر اُسے دل و دماغ عطا کئے کہ سوچ سکے اور جذبات کا حامل ہو سکے۔ ورنہ شعوری اور لاشعوری فیصلوں کی صلاحیت سے محروم ہوتا۔ ان نعمتوں کا ذکر قرآن اپنے الفاظ میں اس طرح کرتا ہے:

وَ اللهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○(۱)

''اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے (اس حالت میں) باہر نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تا کہ تم شکر بجا لاؤ○''

اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کے امتیاز کو بھی انسان کے لئے رحمت بنا دیا:

وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○(۲)

''اور یہ بھی اللہ کی رحمتوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے رات اور دن الگ الگ بنا دیئے۔ تا کہ تم رات کے وقت راحت پاؤ اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو (یعنی کاروبارِ معیشت میں سرگرم رہو) تا کہ تم خدا کی نعمتوں کا شکر بجا لا سکو○''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشَاتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشَاتٍ وَّ النَّخْلَ وَ

---

(۱) القرآن، النحل، ۱۶:۷۸

(۲) القرآن، القصص، ۲۸:۷۳

النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّيْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ۔ (۱)

''اور وہی ہے جس نے برداشتہ اور غیر برداشتہ (یعنی بیلوں کے ذریعے چڑھائے گئے اور بغیر اوپر چڑھائے گئے) باغات پیدا فرمائے اور کھجور (کے درخت) اور زراعت جس کے پھل گوناگوں ہیں اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور (ذائقہ میں) جداگانہ ہیں (بھی پیدا کئے)۔''

انسانی زندگی میں ازدواجیت کو بھی ایک خاص قسم کے سکون اور لطف کا باعث بنا دیا، ارشاد ہوتا ہے:

وَ مِنْ اٰيَاتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً۔ (۲)

''اور یہ بھی اس کی رحمت کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے (یعنی مرد اور عورت) پیدا کر دیئے تاکہ تم ایک دوسرے سے سکون پاؤ اور پھر اُس نے تمہارے (یعنی مرد اور عورت کے) درمیان محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر دیا۔''

قرآن نے ایک اور مقام پر کائناتی سطح پر موجود حسّی رحمتوں کا بیان اس طرح کیا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهَارَ ○ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ

---

(۱) القرآن، الانعام، ۶ : ۱۴۱

(۲) القرآن، الروم، ۳۰ : ۲۱

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ○ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَاط اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ○ (۱)

’’اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان کی جانب سے پانی اتارا پھر اس پانی کے ذریعے سے تمہارے لئے رزق کے طور پر پھل پیدا کئے اور اس نے تمہارے لئے کشتیوں کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے سمندروں میں چلتی رہیں اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو (بھی) مسخر کر دیا○ اور اس نے تمہارے (فائدہ) کے لئے سورج اور چاند کو (باقاعدہ ایک نظام کا) مطیع بنا دیا جو ہمیشہ (اپنے اپنے مدار میں) گردش کرتے رہتے ہیں اور تمہارے (نظامِ حیات) کے لئے رات اور دن کو بھی (ایک) نظام کے تابع کر دیا○ اور اُس نے تمہیں ہر وہ چیز عطا فرما دی جو تم نے اُس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو (تو) پورا شمار نہ کر سکو گے، بیشک انسان بڑا ہی ظالم بڑا ہی ناشکر گزار ہے○‘‘

باری تعالیٰ نے اپنی رحمت کی بعض حسی صورتوں کو گنوا کر بالآخر یہ کہہ دیا کہ کس کس رحمت کا ذکر کیا جائے۔ یہ سلسلہ تو کوئی حد و انتہا ہی نہیں رکھتا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ انسان کو اپنی زندگی کی جملہ آسائشوں اور لذتوں کے لئے جو کچھ مطلوب تھا خواہ اسے اس کا شعور بھی تھا یا نہیں، ہم نے بغیر اس کے مانگے اسے سب کچھ مہیا کر دیا۔ لہٰذا کائنات ارض و سماء کی وسعتوں میں جس طرف چاہو نگاہ اٹھا لو، اس کی رحمت کے نظارے بکھرے ہوئے نظر آئیں گے، چونکہ خدا کی رحمتیں ہر قدم پر فراوانی کے ساتھ انسان کو میسر ہیں، اس لئے اسے ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔

رحمتِ حق کی معنوی صورت

مذکورہ بالا گفتگو سے رحمتِ حق کی حسی صورت واضح ہو چکی ہے۔ راحتیں تو رحمت

(۱) القرآن، ابراہیم، ۱۴: ۳۲۔۳۴

[illegible] رحمت [illegible] قرار دی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کارگہ حیات میں کوئی بھی شئے زحمت نہیں۔ انسان کو کیا خبر کہ پانی کتنی بڑی نعمت ہے اس کا اندازہ تو صرف اسی کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی پیاس کی شدت محسوس کی ہو۔ اسے کیا خبر کہ دھوپ کتنی بڑی نعمت ہے اس کا علم تو انہیں لوگوں کو ہے جو موسمی اثرات کی وجہ سے عرصہ دراز تک سورج کی کرن کو ترستے ہیں۔ اسے کیا خبر کہ نیند کتنی بری نعمت ہے اس کا اندازہ ان سے پوچھو جو بدقسمتی سے معذور ہو گئے ہوں یا جسمانی صحت سے محروم ہوں۔ مختصر یہ کہ ظلمت کے بغیر دن کا، بیماری کے بغیر صحت کا، دھوپ کے بغیر سائے کا، سفر کے بغیر حضر کا، گمراہی کے بغیر ہدایت کا، باطل کے بغیر حق کا اور شر کے بغیر خیر کا، یعنی تضاد کے بغیر کسی حقیقت کی اصل افادیت کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مگر انسان کتنا بے انصاف اور احسان فراموش ہے کہ اسے نعمت ملے تو بھی شکر ادا نہیں کرتا اور محروم ہو جائے تو بھی نعمت کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی بندے پر کوئی تکلیف آ جائے تو وہ اس کے لئے نعمت اور رحمت کیسے بنتی ہے اسکی وضاحت آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہو:

i- تکلیف ...... بنائے احساسِ رحمت

تکلیفوں کا رحمت ہونا دو طرح سے ہے۔ ایک اس طرح کہ تکلیف کے بغیر نعمت کی لذت، لذت نہیں رہتی۔ تکلیفیں نہ ہوں تو نعمت و راحت انسانی زندگی کے لئے کسی بھی خصوصی لطف کا باعث نہ رہیں۔ یہ تکلیفیں ہی ہیں جو حیاتِ انسانی کو لذت آشنا کر دیتی ہیں۔ اور دوسرے اس طرح کہ راحت کے بالمقابل تکلیف کے وجود سے نہ صرف راحت اپنا صحیح مقام حاصل کرتی ہے بلکہ زندگی بھی اسی اتار چڑھاؤ سے صحیح زندگی قرار پاتی ہے۔ اگر یہ حرکت نہ ہو اور زندگی میں ایک ہی حالت کارفرما رہے تو اس میں اور موت میں کیا فرق باقی رہے گا۔ کیونکہ راحت و تکلیف دونوں کے لزوم کے بغیر نہ زندگی کا کوئی مقصد باقی رہتا ہے نہ جدوجہد کا وجود۔ اس بزمِ حیات کی گرمی اور رونق، راحت و تکلیف دونوں کے دم قدم سے ہے۔ اگر ایک عنصر کلیتاً ختم ہو جائے تو زندگی سوائے جمود و تعطل کے کچھ

باقی [illegible] جس کے نتیجے میں انسان راحتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اگر تکلیف کا وجود باقی نہ رہے اور صرف راحت ہی راحت ہو تو پھر سعی وکاوش کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ آپ روزمرہ کے معمولات میں بھی اس امر کا اندازہ لگاتے ہوں گے کہ اگر کرنے کا کوئی کام نہ ہو، بالکل فراغت ہو تو انسان بیٹھا بیٹھا اکتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت گزارنے کے لئے خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کر لیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بے مقصدیت اور جمود و تعطل زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہنے دیتے۔ اصل لطف کسی لذت کو پانے کی آرزو اور اس کی کوشش میں ہے۔ جو لذت بغیر محرومی کے اور بغیر آرزو کے اور بغیر کوشش کے ازخود میسر آ جائے وہ درحقیقت لذت نہیں رہتی۔ چنانچہ اس خلاق اعظم نے حیات انسانی کے لئے لاکھوں نعمتوں اور راحتوں کو پیدا کیا تاکہ انسان اس سے لذت وسکون حاصل کرے اور اگر ان کے بالمقابل مصائب و آلام اور شدائد وتکالیف کے عوارضات سرے سے پیدا ہی نہ کرتا تو کوئی راحت، راحت نہ رہتی اور کوئی لذت، لذت نہ ہوتی۔ چنانچہ اس نے راحت اور اس کی گوناگوں لذتوں کو صحیح مقام دینے کے لئے زندگی میں تکلیفیں بھی پیدا کر دیں تاکہ ان تکلیفوں سے گزر کر انسان جب راحتوں کی منزل تک پہنچے تو اسے وہی لطف محسوس ہو جس کی اسے تلاش تھی۔ اس لئے راحتیں حسی رحمت اور تکلیفیں معنوی رحمت۔ تاکہ انسان کو نعمت بھی ملے، اور اس کا صحیح لطف و لذت بھی ملے۔ اِس امر کی وضاحت میں ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ ہو:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ (١)

"یقیناً تکلیف کے ساتھ راحت ہے ○ یقیناً تکلیف کے ساتھ راحت ہے ○"

□ii- تکلیف ...... وجہ التفاتِ رحمت

جیسا کہ "رحمت کے معنی ومفہوم" کے عنوان کے تحت پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر تکلیف اس وجہ سے معنوی رحمت ہے کہ وہ رحمت وعنایت اور فضل واحسان کا باعث بنتی

---

(١) القرآن، الانشراح، ٩٤: ٥-٦

ہے کیونکہ رحمت کا [illegible] کی [illegible] ہے اور کسی کا تکلیف میں مبتلا ہونا رحمت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس لئے تکلیف منافی رحمت نہیں بلکہ سبب رحمت قرار پاتی ہے۔ بسا اوقات تکلیف کے ظاہری عوارض کو دیکھ کر انسان پریشان ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں خدا جانے کس وجہ سے مبتلاء زحمت ہوں لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی یہی حالت استحقاقِ رحمت کی بنیاد ہے۔ جس طرح موت نئی زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ رات کا اندھیرا نئے دن کے اجالے کی خبر لاتا ہے اور ہر شام نئی صبح کی اساس بنتی ہے۔ اس طرح ہر تکلیف نئی راحت ونعمت کا باعث بنتی ہے۔ دریائے رحمت کسی کو غمزدہ اور گرفتار مصیبت دیکھ کر اتنا جوش میں آتا ہے کہ اس کی بہتری اور بھلائی کی ہزاروں نئی صورتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ جس کا اسے گمان تک نہیں گزرتا۔ لہٰذا تکلیف اس وجہ سے معنوی رحمت قرار پائی کہ وہ صاحبِ رحمت کی شفقت والتفات کو پہلے سے بھی زیادہ ارادۂ احسان کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے، کسی پریشان حال کے رونے کو مسکراہٹ میں بدل کر ذاتِ رحمٰن ورحیم کو اتنی مسرت ہوتی ہے کہ شاید اس قدر کسی اور پر رحم کرنے سے نہیں۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکشوفات میں بیان فرماتے ہیں کہ:

قلت یا رب ای ضحک افضل عندک؟ قال ضحک الباکین۔(۱)

''میں نے عرض کیا اے پروردگار! کون سی ہنسی تیرے نزدیک اچھی ہے اللہ نے فرمایا۔ رونے والوں کی ہنسی۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

جعلت الفقر والفاقة مطية الانسان فمن رکبها فقد بلغ المنزل قبل ان يقطع البوادی۔(۲)

---

(۱) غوث الاعظم، الرسالہ: ۷۱

(۲) غوث الاعظم، الرسالہ: ۴۰

یعنی جس نے فقر و فاقہ کو اپنے لیے سواری بنا لیا ہے وہ اس پر
سوار ہو گیا وہ راستے طے کیے بغیر منزل تک پہنچ گیا۔''

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اِس تصور کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ؎

دل بدست آور که حج اکبر است
از هزاراں کعبه یک دل بهتر است
کعبه بنگاه خلیل آذر است
دل گزرگاه جلیل اکبر است

اصحابِ صفہ کی فقر و فاقہ اور مشقت سے بھرپور زندگی کا ایک پہلو ملاحظہ ہو:

كان إذا صلى بالناس يخرّ رجال من قامتهم في الصلوٰة من الخصاصة و هم أصحاب الصفة حتى يقول الأعراب هؤلاء مجانين فإذا صلىّ رسول الله إنصرف إليهم فقال لو تعلمون ما لكم عند الله لأحببتم أن تزدادوا فاقة۔(۱)

''فقر وفاقہ کے باعث ان کی کمزوری اورنقاہت کا یہ عالم تھا کہ نماز میں کھڑے ہوتے تو گر پڑتے۔ اُن کی حالتِ زار دیکھ کر اَعرابی انہیں دیوانہ کہتے تھے۔ جس پر رسولِ خدا ﷺ نے ان سے فرمایا اگر تمہیں یہ علم ہو جائے کہ ان کی اس حالت زار کا مقام بارگہِ اُلوہیت میں کیا ہے تو تم بھی بکثرت فاقہ اختیار کرنے کو پسند کرو۔''

لہٰذا وہ حالت جو خود رحمت الٰہی کا استحقاق پیدا کر دے، بندے کے حق میں زحمت نہیں ہو سکتی۔

---

(۱) ترمذی، الجامع الصحیح، ۴: ۵۸۳، ابواب الزھد، رقم: ۲۳۶۸

iii- تکلیف ...... تادیبی رحمت

تکلیفوں اور پریشانیوں کا معنوی رحمت ہونا بایں وجہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات انسان کے لئے عبرت واصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ ایک چیز بادیٔ النظر میں رحمت معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کی حقیقت اور انجام کو دیکھا جائے تو وہ بھی رحمت ہوتی ہے۔ مثلاً اولاد یا شاگرد کی خطا پر از رہِ تعلیم وتادیب اُسے مارنا ظاہراً زحمت اور تکلیف معلوم ہوتا ہے، مگر یہ بھی فی الواقع رحمت ہے۔ کیونکہ اس بچے پر احسان یہی ہے کہ اسے بری عادات سے بچایا جائے، خطا کاری اور بد اعمالی سے محفوظ کر کے اس کی صحیح تربیت کی جائے۔ اگر اس سزا سے وہ بچہ برے انجام سے بچ جائے تو کیا یہ سزا اُس کے لئے زحمت ہوئی یا رحمت؟

اگر اسے سزا نہ دی جاتی، پیار کیا جاتا اور اُسے غلط راستے پر بدستور گامزن رہنے دیا جاتا تو انجامِ کار وہ نہ صرف اپنی تباہی و ہلاکت کا باعث ہوتا بلکہ معاشرے کے دوسرے افراد بھی اُس کی بدکرداریوں کے منفی اثرات سے متاثر ہوتے اور ان کے لئے اس کا عمل اذیت کا باعث ہوتا۔ چنانچہ تادیبی سزا جو اس وقت بادی النظر میں تکلیف اور زحمت معلوم ہو رہی تھی اس کے لئے اور باقی معاشرے کے لئے رحمت بن گئی۔ اسی طرح حیاتِ انسانی میں پیش آنے والے مصائب و آلام رب العالمین کی شان ربوبیت ہی کا ایک پہلو ہیں۔ انسان کو کیا خبر کہ ایک تکلیف نے جسے وہ زحمت سمجھ رہا ہے اسے کتنے برے انجاموں سے بچا لیا۔ بسا اوقات ایک حادثہ کسی انسانی زندگی کو ہمیشہ کے لئے سنوار دینے کا باعث ہو جاتا ہے۔ لہٰذا رب رحمٰن اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت انسان کی بہتری کے لئے اسے مختلف حالتوں سے دوچار کرتا رہتا ہے۔ ہر حالت حقیقت میں اس کے لئے رحمت ہوتی ہے، مگر انسان کو بعض اوقات اس کا شعور نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم میں مذکور ہے:

عَسٰٓی اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡئًا وَّ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَ عَسٰٓی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ۔(۱)

---

(۱) القرآن، البقرہ، ۲: ۲۱۵

اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لئے بہتر ہو اور

(یہ بھی) ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ (حقیقتاً) تمہارے لئے بری ہو۔"

انسان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جسے وہ تخریب سمجھ رہا ہے، وہ بھی کسی تعمیر کا پیش خیمہ ہو گی۔ سونے پر بھٹی کی آگ سے گزرنے اور کٹھالی میں پگھلنے کا مرحلہ نہ آتا تو اسے خالصیت اور چمک دمک نصیب نہ ہوتی۔ لکڑی کا سینہ آرے میں نہ چرتا تو خوبصورت فرنیچر معرضِ وجود میں نہ آتا۔ مٹی بھٹے کی آگ میں نہ جلتی تو دیدہ زیب عمارات منصۂ شہود پر نہ آتیں۔ پتھروں کے وجود ریزہ ریزہ نہ ہوتے تو ہزاروں مصنوعات کی تخلیق نہ ہوتی، ہیرے کے کونے نہ تراشے جاتے تو اس کی آب وتاب اور جلوہ ریزیاں نہ نکھر سکتیں۔ مالی درختوں اور پودوں کی شاخیں نہ کاٹتا تو باغ کا حسن نہ نکھر سکتا۔ الغرض کونسا کام دنیا میں ایسا ہے جس میں ظاہری تکلیف کے بغیر حسن وکمال نصیب ہو جاتا ہو۔ یہ سب احوالِ زندگی باری تعالیٰ کی رحمت کے پرتو ہیں خواہ حسی ہوں یا معنوی۔

بنا بریں اللہ تعالیٰ نے بجائے اپنی دیگر صفات کے ذکر کے صفتِ رحمت کے ذکر کو منتخب فرمایا کیونکہ یہ اُس کا ایسا وصف تھا جو ہر فعل میں جلوہ گر تھا۔